R. No 2186 ...   Regd. No A. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telegrams "ANJUMAN"

جلد ۲۰- شمارہ ۲۸ | ایڈیٹر- آل احمد سرور | علی گڑھ- ۲۲ جولائی ۱۹۶۱ء

عطا محمد شعلہ

ریاض خیرآبادی

ریاض نے ۱۸۵۳ء میں ضلع سیتاپور کے مشہور قصبہ خیرآباد کے ایک معزز گھرانے میں آنکھ کھولی۔ اور ۳۰ جولائی ۱۹۳۴ء عیسوی کو اکیاسی سال کی عمر میں خیرآباد ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اکیاسی سال کے اس طویل عرصے میں انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کا غالب حصہ شامل ہے۔ یہ عرصہ اپنی ہنگامہ خیزیوں کی بدولت اور اپنے دوررس اثرات کے باعث تاریخ ہند کا ایک عہد آفریں دور رہا۔ جہاں ایک طرف اس طویل عرصے میں ہندوستان کو بدیشی حکومت کے تاریک ترین اور غلامی کے ذلیل ترین دور سے گزرنا پڑا وہیں ایک طرف یہ بھی طے ہے کہ اندر ہی اندر آزادی کی آگ نے قومی خصوصیات کو کچھ اس طرح تپا یا کہ کندن بنا دیا اور یہ آگ اندر ہی اندر ایک ایسا لاوا بنا تی رہی کہ جس نے بعد میں اُبل کر برٹش حکومت کے خس و خاشاک تک کو جلا دیا اور قومی افق پر ایسے تارے چمکائے کہ جن کی ضیا سے ہندوستان ہی نے نہیں بلکہ ساری دُنیا نے کسب نور کیا جن میں مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی مرحوم، حکیم اجمل خاں، سی۔ آر۔ داس، لاجپت رائے، مولانا حسرت موہانی اور مولانا آزاد وغیرہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس پس منظر میں جب ہم ریاض خیرآبادی کی شاعری کو دیکھتے ہیں تو ہمیں تھوڑی سی مایوسی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ان کی زندگی کے طویل عرصے میں جو ایک سیاسی بھونچال آیا اور اس کے نتیجے میں ہماری سیاسی اور اقتصادی زندگی میں جو دوررس تبدیلیاں ہوئیں ان کے اثرات ہم کو ریاض کے کلام میں ڈھونڈھے بھی نہیں ملتے۔ برخلاف اس کے ہم کو ان کی شاعری میں کھلنڈرا پن، شوخی، بے فکری، خوش باشی، بشاشت اور ایک خودمستی کا احساس ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان خارجی حالات سے چشم پوشی ہی کے لئے اپنے چاروں طرف شاعری کا ایک حصار کھینچ لیا اور اس حصار میں بیٹھ کر انھوں نے اپنی ساری زندگی ایک خودمستی کے عالم میں گزار دی۔ لیجئے ثبوت میں ان کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیے۔

جبیں گھِس کے بچھے ہوں گے نہ سجدوں کا نشاں ہوگا
جبیں ہوگی ہماری اور ان کا آستاں ہوگا

بہت ہی خیر گذری ہوتے ہوتے رہ گئی ان سے
جسے میں غیر سمجھا ہوں وہ میرا پاسباں ہوگا

قفس میں آؤں تو دے گا جگہ صیاد آنکھوں میں
چمن میں جاؤں تو ہر پھول میرا آشیاں ہوگا

وہاں بھی پھول برسیں گے گنہگارانِ امت پر
جو دو چار آئے ہم سے تو جہنم بھی جناں ہوگا

ذریعہ ہے یہی رحمت کا کعبے تو بھی لے زاہد
یہ میرا پھول سا بارِ گنہ مجھ پر گراں ہوگا

ریاض کی شاعری میں اگر ان کے زمانے کے سیاسی حالات کا عکس نہیں ملتا تو نہ ملے لیکن ان کی شاعری ان کے گرد و پیش کے سماجی حالات کا ایک ایسا آئینہ ہے کہ جس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ ریاض اپنے زمانے کے اودھ کی سماجی زندگی کا بڑا اچھا عکاس ہے۔ تاریخ کے اوراق پلٹئے تو معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی سماجی زندگی اس سارے اُتھل پتھل اور سیاسی شکست و ریخت کے عمل سے بظاہر بے نیاز نظر آتی ہے۔ عیش پسندی، عیاشی، شوخی، بے فکری، خودمستی، کھلنڈرا پن، تصنع اور تکلفات اس بری طرح چھائے ہوئے تھے کہ عام انسانوں کو اودھ کی اس دور کی سماجی زندگی میں خوش باشی کے ان عناصر کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اودھ کی زندگی کا یہی رُخ ہے جس کی صحیح تصویریں ریاض کے کلام میں ملتی ہے۔

شدید ترین سیاسی زوال اور اقتصادی بدحالی کا ردِ عمل ایک شعور سے عاری سماج پر اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟ ریاض بھی اس معنی میں کوئی باشعور فنکار نہ تھے ورنہ یقیناً وہ زندگی کے اس پہلو سے ساز باز نہ کرتے اور ان کے یہاں فکر و فن کا امتزاج ان کی شگفتہ طبیعت سے قلم کھا کر کسی اور ہی شکل میں نمایاں ہوتا۔ اگرچہ ان کی صحافیانہ زندگی پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے احساسات کے اظہار میں کافی بے باک اور صاف گو تھے اور اس صاف گوئی اور بے باکی کی قیمت بھی انھیں چکانا پڑی لیکن اپنی شاعری پر انھوں نے اس کا پرتو نہ پڑنے دیا اور اس طرح کی غزلیں بدستور کہتے رہے۔

آئینہ دیکھتے ہی وہ دیوانہ ہوگیا دیکھا کسے کہ شمع سے پروانہ ہوگیا
گل کرکے شمع سوئے تھے ہم نامراد آج روشن کسی کے آنے سے کاشانہ ہوگیا
دیوانہ قیس پہلے ہمیں چھیڑتا رہا پھر رفتہ رفتہ نجد میں یارانہ ہوگیا

مے توبہ کے آئی تھی لبِ گورِ ریاض
لبریز اپنی عمر کا پیمانہ ہوگیا

افسوس ہے کہ ریاض نے اپنی ڈرامائی قوت کا صرف ہزلی اور عاشقانہ مضامین پر کیا۔ سنجیدگی شاید ان کا حصہ ہی نہ تھی۔ اگر کہیں وہ اپنی سہل پسندی سے چھٹکارا پالیتے اور اپنی اس صلاحیت کو سنجیدگی اور فنی شعور کے ساتھ استعمال کرتے تو پتہ نہیں کہ وہ کن بلندیوں کی خبر لاتے۔

اودھ کی معاشرت میں جو ایک طرح کی خودمستی سرایت کئے ہوئے تھی ریاض اس کے عکاس بن کر رہ گئے مصور نہ ہو سکے۔ عکاس جہاں کیمرہ سے ہو بہو تصویر اتارتا ہے، مصور خطوط اور رنگ کے امتزاج سے ذہنی اور فکری احساسات کو بھی ابھارنے کی کوشش کرتا ہے اور گرد و پیش کے اس ماحول کو بھی پیش کرتا ہے کہ جسکی بنا پر فکر کی وہ لہریں موجزن ہوتی ہیں کہ جن کو مصور نے تصویر میں ابھارا ہے۔ افسوس ریاض کے یہاں مصور کا یہ شعور ناپید ہے۔ اس خودمستی اور کھلنڈرے پن کی بہترین معاون شراب ہی ہوسکتی ہے اور ریاض نے دخترِ رز کے وہ گن گائے ہیں کہ آپ لاکھ قسمیں کھائیے کہ ریاض نے پیا تو کیا کبھی چکھی بھی نہیں لیکن سننے والے اس بات پر کان نہیں دھریں گے۔ ذیل کے اشعار میرے دعویٰ کا ثبوت ہیں۔

جس دن سے حرام ہوگئی ہے مے خلد مقام ہوگئی ہے
توبہ سے ہماری بوتل اچھی جب ٹوٹی ہے جام ہوگئی ہے

بھر بھر کے جام بزم میں چھلکائے جاتے ہیں
ہم ان میں ہیں جو دور سے ترسائے جاتے ہیں

یہ کالی کالی بوتلیں جو ہیں شراب کی
راتیں ہیں بند ان میں ہمارے شباب کی
چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

اب آپ ہی کہئے کہ ان اشعار کی موجودگی میں یہ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ ریاض نے چکھی بھی نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ریاض عمر بھر ایک رند پارسا رہے۔ اور اس خلد مقام مے کی ایک بوند بھی کبھی ان کی زبان تک نہ پہنچ پائی۔ شاید فراق نے اسی لئے ان کو اداکار کہا ہے کہ جس چیز کا انھوں نے ذائقہ بھی نہیں چکھا اس پر زندگی بھر اتنا اور ایسا کہا کہ ان کو اس موضوع پر عام طور پر سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے۔

ریاض کی عمر کا بہترین حصہ گورکھپور میں گذرا۔ ریاض کی یہ وہ عمر تھی کہ جب زخم کھانے اور زخم دینے کے دن ہوتے ہیں۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوران کا رنگین ترین دور رہا اور انھوں نے اپنی جوانی سے گن گن کر بدلے لئے اور اس کے عوض گورکھپور کی تعریف میں کچھ ایسی محویت اور عاشقانہ ادا سے لکھا کہ گورکھپور کے نام بقا کا پٹہ لکھ گئے۔ دیکھئے اس غزل میں کس لہک کے ساتھ انھوں نے گورکھپور کو یاد کیا ہے۔

ہوئی ہے میری جوانی فدائے گورکھپور
لحد سے آئے گی آواز ہائے گورکھپور

اودھ کی شام بنارس کی صبح ہو صدقے
کہ اک جہاں سے جدا ہے ادائے گورکھپور

ہم اپنے خونِ تمنا سے سینچ آئے ہیں
حسین لگائیں منگا کر حنائے گورکھپور

چمن میں حور بھی حسنِ شباب بھی مے بھی
جسے بہشت میں جانا ہو آئے گورکھپور

ریاض تم نے کہی ہے اسی لئے یہ غزل
برا کہیں نہ حسیں دل رُبائے گورکھپور

اور پھر وہ مشہور شعر ؎

جوانی جن میں کھوئی ہے وہ گلیاں یاد آتی ہیں
بڑی حسرت سے لب پر ذکرِ گورکھپور آتا ہے

ریاض زندگی اور جوانی، خوش باشی اور آزادہ روی کا ایک ایسا نغمہ خواں تھا کہ اپنی ساری سطحیت کے باوجود زندگی اور اس کے حسن سے محبت اور شغف کی جو تصویر اس نے پیش کی ہے وہ امٹ ہے اور اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریاض بہت بڑا شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی ایک ایسا شاعر ضرور ہے کہ جس کی قدر و قیمت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ (بشکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ لکھنؤ)

اداریہ

سمپورنانند جی اور اُردو

سمپورنانند جی کا ہم احترام کرتے ہیں، وہ ہمارے مشہور اور ممتاز رہنماؤں میں سے ہیں، اُنکی شاندار قومی خدمات کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ اتر پردیش کی بساط پر جو گلکاریاں ہوئی ہیں، اُن کی صناعی و زیبائی میں اُن کا خونِ جگر بھی شامل ہے۔ وہ آزادی کی جدوجہد کے بڑے سپاہیوں میں سے ہیں، انھوں نے آزادی کے بعد ملک کی تعمیر و ترقی میں بھی نمایاں حصہ لیا ہے۔ مگر اُن کے یہاں ایک بڑی کمزوری ہے جسکی وجہ سے وہ ہمیشہ ہماری قومی زندگی میں ایک نزاعی رول ادا کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے ہمارے غیر مذہبی ریاست کے تصور کو دل سے قبول کیا ہے۔ جمہوریت کی رواداری اور فراخ دلی کو، مشترک تہذیب کی اس بنیاد کو جس کے متعلق اب کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔ مذہبی اقلیتوں سے اُن کا جو بھی سلوک رہا ہو اس کے متعلق ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے، اور نہ ہمیں اس کا حق پہنچتا ہے، لیکن لسانی اقلیتوں کے متعلق اُن کا رویہ اور جو کچھ بھی ہو، ہمدردانہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کے سلسلے میں شروع سے اُن کے یہاں ایک تنگ نظری ملتی ہے اور اردو بولنے والوں کی ہر اس پُرخلوص کوشش کو جو انھوں نے اس قومی زبان کا حق منوانے کے لئے کی ہے، انھوں نے شبہہ کی نظر سے دیکھا ہے۔ یہی نہیں اگر کسی نے اُردو کے ساتھ انصاف کی کچھ کوشش بھی کی ہے تو انھوں نے اس میں سیکڑوں خطرے دیکھ لئے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب اُدھر اتر پردیش کی حکومت نے زبان کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی، اُدھر سمپورنانند جی نے اسکے خلاف ایک بیان دے دیا۔ کاشی ناگری پرچارنی سبھا کی اڑسٹھویں سالگرہ منائی جارہی تھی، یہ موقع ہندی ادب کی مزید ترقی کے لئے مناسب مشورے دینے کا تھا اُردو کمیشن کے قیام کے جواز یا عدمِ جواز کی بحث کا نہ تھا مگر سمپورنانند جی اپنی عادت سے مجبور تھے۔ انھوں نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے پہلے تو فتویٰ دے دیا کہ اُردو بولنے والوں کی آبادی لسانی اقلیت نہیں کہی جاسکتی، ظاہر ہے کہ پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھی جاتی ہے تو پوری عمارت ٹیڑھی بنتی ہے۔ چونکہ اُردو بولنے والے لسانی اقلیت نہیں ہیں، اس لئے اُردو کے لئے اتر پردیش میں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ سمپورنانند جی کو یاد نہیں رہا کہ جب وہ اتر پردیش میں وزیرِ تعلیم تھے تو اُنکی پالیسی کے تحت یہ اعلان کردیا گیا تھا کہ اتر پردیش میں ہر شخص کی مادری زبان ہندی ہے۔ جب انجمن کا ایک وفد ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں ان سے ملا اور انھیں توجہ دلائی کہ مادری زبان کے متعلق فیصلہ کرنے کا سرکاری افسروں کو کیا حق ہے؟ تو انھوں نے تسلیم کیا کہ یہ حکم غلط ہے اور بعد میں اسے منسوخ کرنے کے لئے کارروائی کی۔ چونکہ سمپورنانند جی اُردو کو ایک مستقل، خود مختار اور آزاد زبان نہیں سمجھتے، بلکہ اسے ہندی کا ایک اسلوب یا شیلی کہتے ہیں، اس لئے ان کے نزدیک اُردو بولنے والے ایک لسانی اقلیت نہیں ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ دستور میں اُردو کو ایک علاحدہ زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے، دوسری زبانوں کے ساتھ اُسے بھی تمام قومی رہنما ایک قومی زبان مانتے ہیں اور آج کے ماہر بھی مانتے ہیں کہ اُردو بولنے والے ایسا سمجھتے ہیں اور اس معاملے میں اُردو بولنے والوں کی رائے کی سمپورنانند جی کی رائے کے مقابلے میں زیادہ اہمیت ہے۔ رہی ہندی سے قرب کی بات، تو کوئی سنجیدہ اُردو داں اُردو اور ہندی کی ایک بنیاد سے انکار نہیں کرتا، کوئی دونوں کے گہرے اور اٹوٹ تعلق کو نظر انداز نہیں کرتا، لیکن اس تعلق کی خاطر تاریخ کے بہاؤ، ادبی سرمائے، محاوروں کے خزانے، شاعری کے کارناموں کو محض ایک اسلوب یا شیلی نہیں کہہ سکتا۔ ایک زمانہ تھا جب سمپورنانند جی اُردو کے بیش بہا سرمائے کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ شکر ہے کہ اب وہ اُسے "ہماری زبان" کہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اُردو صرف چند شہروں میں بولی جاتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب انھیں علم ہو گیا کہ اتر پردیش میں کوئی ضلع ایسا نہیں جس میں لوگ اُردو نہ بولتے ہوں۔ وہ جب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اتر پردیش میں کوئی ضلع ایسا نہیں جس میں لوگوں کی زبان صرف اُردو ہو تو یہ بھول جاتے ہیں کہ ریاستوں کی نئی تنظیم کے کمیشن نے اقلیت کی زبان کے لئے ریاست یا ضلع کی قید نہیں لگائی ہے، بلکہ تحصیل یا تعلقہ کو بھی ایک علاقہ مانا ہے۔ اس نے صرف یہ قید لگائی ہے کہ اگر لسانی اقلیت تیس فی صدی ہو تو اس علاقے میں اقلیت کی زبان کو بھی سرکاری طور سے تسلیم کیا جائے۔ سوال تیس فی صدی کا نہیں، سوال اصول کا ہے، یہ اصول تسلیم کرلیا گیا اور پارلیمنٹ اور حکومت نے یہ رپورٹ منظور کرکے تسلیم کرلیا کہ علاقے کا اطلاق تحصیل یا تعلقہ پر بھی ہو سکتا ہے۔ اس اصول کو حال میں جنوبی منطقے کی کونسل نے بھی مان لیا ہے۔ ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے نے تو یہاں تک کہا ہے کہ پانچ فی صدی اقلیت کی زبان کو بھی سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے۔

سمپورنانند جی نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کے زمانے میں اُردو کے متعلق جو پالیسی تھی وہ اچھی تھی، اگر نیچے درجے پر کچھ کوتاہیاں ہوئی ہیں تو اُنکی اصلاح کافی ہے۔ نیچے درجے پر کوتاہیاں ہی نہیں ہوتیں، انکار اور پہلوؤں کی بے نیازی پائیے تو نیچے میں ڈھونڈھا جاسکتا ہے۔ اگر اتر پردیش میں اُردو کو اس کا حق دیا گیا اور اسے سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا تو اس سے قومی وحدت اور سالمیت کو خطرہ نہ ہوگا بلکہ یہ وحدت اور مضبوط ہوگی۔ ہاں جب تک اس حق کو تسلیم نہیں کیا گیا اس وقت تک اُردو بولنے والے شاکی رہیں گے اور ملک کی ترقی میں اطمینان اور خوش دلی کے ساتھ حصہ لینے کے قابل نہ ہوسکیں گے۔ اس لئے قومی نقطۂ نظر سے اُردو کے حقوق کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ شیلی یا اسلوب کی بات کرکے یا قومی وحدت کو خطرے کا بگل بجاکر مسئلے کو اُلجھانا قومی خدمت نہیں۔ سمپورنانند جی اگر اپنے زمانے میں اُردو کے شاندار اسلوب کو ہندی کے اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں داخل کرتے اور تلسی، سورداس کے ساتھ میر، درد، نظیر، انیس، غالب کو پڑھاتے تو کم سے کم یہ تو کہا جاسکتا کہ وہ اس اسلوب کی عظمت کو مانتے ہیں۔ اب تو صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلوب یا شیلی کی بات کرکے اُردو کو نظر انداز کرنے کے لئے بہانہ تراش رہے ہیں۔ اگر سوئٹزرلینڈ میں چار زبانوں کو سرکاری درجہ دیتے ہوئے قومی وحدت کو برقرار رکھا جاسکتا ہے تو اتر پردیش میں ہندی کے علاوہ اردو کو بھی سرکاری طور پر تسلیم کرنے سے قومی وحدت کیوں خطرے میں پڑ جائے گی۔ کاش سمپورنانند جی اس پر بھی غور کرسکتے۔

لسانی کمیٹی اتر پردیش کا پہلا جلسہ

یو پی لسانی کمیٹی کا پہلا جلسہ ۱۵ جولائی ۱۹۶۱ء کو کونسل ہاؤس لکھنؤ میں ہوا۔ یہ کمیٹی حکومت اتر پردیش نے ایک اقلیتی زبان کی حیثیت سے ریاست میں اُردو زبان کی صورت حال کی جانچ کرنے اور اس کے تحفظ اور ترقی کے لئے تجاویز پیش کرنے کے لئے ۲۳ جون ۱۹۶۱ء کو مقرر کی تھی۔

کمیٹی کے صدر اچاریہ جے۔ پی۔ کرپلانی نے اس جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کسی منطقہ میں مختلف زبانوں کا مسئلہ حل کرنا مشکل نہ ہونا چاہیے لیکن بد قسمتی سے ہندستان میں یہ مسئلہ جذبات کو مشتعل کرتا ہے اور کبھی کبھی تو اس سلسلے میں فسادات تک کی نوبت آجاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ "یورپ اور ایشیا میں مذہبی، نسلی اور قومی تصادم ہوئے ہیں لیکن یہ تصادم زبانوں کے سلسلے میں کبھی نہیں ہوئے ہیں۔ بہت سے مسائل جو دوسرے ممالک میں بآسانی حل ہو جاتے ہیں وہ بد قسمتی سے ہمارے ملک میں جذبات کو مشتعل کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔"

انھوں نے کہا کہ آج جو مسائل ہمارے سامنے ہیں ان سے دوسرے ممالک بھی دو چار رہے ہیں۔ یوگوسلاویہ اور سوئٹزر لینڈ کے ممالک کو متعدد بولیوں کے علاوہ ملک کی پانچ اور چار زبانوں کے ساتھ کام چلانا پڑا ہے۔ انھوں نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر ہمیں کیوں زبان کے مسئلے پر جھگڑے ہوتے ہیں۔"

انھوں نے کہا کہ مہاتما گاندھی نے کئی ہندستانی زبانیں سیکھنے کی کوشش کی۔ اپنی آخیر عمر میں جب وہ بنگال کا دورہ کر رہے تھے انھوں نے بنگلہ زبان سیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اگر ہم ان کے نقش قدم پر چلیں تو صورت حال بہتر بنائی جا سکتی ہے۔

"یہ بد قسمتی کی بات ہے کہ اُردو اور ہندی کے مسئلے کو مذہب اور ثقافت سے خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ کسی مخصوص زبان کا رشتہ کسی مخصوص مذہب سے جوڑنا غلط ہوگا۔ ہندی زبان کا ہندو دھرم سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اسی طرح اُردو کے رشتے کو اسلام سے نہیں جوڑنا چاہئے۔ ہندو دھرم کے مختلف ادوار میں مختلف زبانیں مستعمل رہی ہیں۔ اسی طرح عرب، ایران، ترکی اور افغانستان میں اسلام کسی مخصوص زبان تک محدود نہیں رہا ہے۔ جہاں تک اُردو کا تعلق ہے اس میں ادیب اور شاعر ہندو بھی ہوئے ہیں اور مسلمان بھی ہوئے ہیں۔"

اچاریہ کرپلانی نے اس امر پر زور دیا کہ کمیٹی میں جو تبادلۂ خیالات ہوں گے ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے کیونکہ نہ تو ہندی ہندو دھرم کے مترادف ہے اور نہ اردو اسلام کے مترادف۔

انھوں نے کہا کہ ہماری تہذیب ایک مشترکہ تہذیب ہے جسے ہندستانی تہذیب کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہماری تہذیب پر آریائی اور دراوڑی تہذیب کے واثرات پڑے وہ ماقبل تاریخی دور سے تعلق رکھتے ہیں اور اب ان دونوں تہذیبی دھاروں کو الگ کرنا مشکل ہوگا۔ بعد ازاں ہماری تہذیب پر اسلامی تہذیب کا اثر پڑا۔ زمانۂ وسطیٰ میں بیشتر مذہبی اصلاحات پر اسلام کی گہری چھاپ تھی جیسے گرو نانک اور کبیر وغیرہ کے مذہب پر۔ فنون لطیفہ کی ترقی اور نظم و نسق کی اصلاحات میں اسلام کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ اسی طرح عہد حاضر میں قانون، نظم و نسق اور جمہوریت کے جدید نظریات کی ترویج میں مغرب کا بہت بڑا حصّہ ہے۔

انھوں نے کہا کہ "ہمیں اپنی تہذیب کو ہمیشہ ایک مشترکہ تہذیب سمجھنا چاہیے اس کے ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے۔" ہمیں یہ نہیں فراموش کرنا چاہیے کہ منطقائی تہذیبیں ایک تہذیب کے مختلف پہلو تھے۔ ہمارے لئے آپس میں ملانے والی باتیں زیادہ بنیادی ہیں بہ نسبت ان باتوں کے جو ہمیں الگ کرتی ہیں۔ ہم اردو اور ہندی کی باتیں کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عوام کی بھاری اکثریت مقامی بولیوں جیسے بھوجپوری، برج بھاشا، بندیلی اور اودھی وغیرہ کا استعمال کرتی ہے۔

اچاریہ جی نے کہا کہ خوش قسمتی سے اردو اور ہندی کے قواعد اور صرف و نحو میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ صرف ادبی تخلیقات میں دو اسٹائل ہیں۔ اور اصل فرق رسم خط کا ہے۔ انھوں نے کہا کہ "اگر رسم خط ایک ہو جائے تو ان دونوں کے درمیان اختلافات کم ہو جائیں گے۔"

(باقی صفحہ ۹ پر)

حصہ نظم

غزل

مظہر امام

کھیلتی ہے عارضِ گلگوں سے زلفِ عنبریں
محتسب کی آنکھ میں چبھتا ہے وصلِ کفر و دیں

حادثوں کی بدلیاں گھِر گھِر کے آتی ہی رہیں
جگمگاتی ہی رہی میرے ستاروں کی جبیں

عشرتِ نشو و نما سے آج بھی واقف نہیں
میری کلیوں کا وطن، میرے گلوں کی سرزمیں

اپنی کھیتی جا رہی ہے اور مری کشتی نہیں
کس قدر بے باک ہے تیری نگاہِ شرمگیں!

ہے یہی شہرِ نگاراں وصل و فرقت کا دیار
میرا دوزخ بھی یہیں ہے، میری جنت بھی یہیں

شدتِ سوزِ دروں کا معجزہ کہیے امام
دل کا ہر اک داغ ہے اب آفتابِ احمریں

نامراد دل

ادریس احمد [illegible]

نامراد دل میرا
رنگ و روپ کے پیچھے
جاگتا رہا برسوں
نوشگفتہ پھولوں کو
چومنے کی حسرت میں
جاگتا رہا برسوں
جو بھی راہ سے گزرا
جامِ حسن چھلکاتا
شیفتہ ہوا اس پر
جو بھی سامنے آیا
نغمۂ وفا گاتا
یہ ہوا فدا اس پر
جس نے پیار سے دیکھا
ایک بار بھی اس کو
بس یہ مر مٹا اس پر
کتنی بار سمجھایا
ٹھہر اے دلِ ناداں
عمر کی [illegible]
شام ہجر کالی ہے
پھر مری صداؤں کو
دوست سنا اس نے
اور مجھ کو ناصح کا

اک لقب دیا اس نے
پھر بھی آج تک میں نے
اس کی التجاؤں کو
شہر شہر پھیلایا
اس کے ہر اشارے کو
میں نے محترم سمجھا
اس کے نو بہ نو غم کو
میں نے اپنا غم سمجھا
اس کی ہر تمنا کو
میں نے معتبر جانا
اس کو راہِ ہستی میں
اپنا ہمسفر جانا
اُف مگر یہ ظالم دل
میرا راہزن نکلا
اس کے ننھے سینے کا
التہاب قاتل تھا
اس کے خونِ تازہ کا
اضطراب قاتل تھا
اس کی بیقراری نے
لوٹ لی مری دنیا
اس کی آہ و زاری نے
پھونک دی مری دنیا

غزل

آفتاب شمسی

سبق یہ لے کے اُٹھا ہوں شراب خانے سے
کہ بھولنا مجھے مشکل ہے اس پیمانے سے

ہنوز گرمیِ ذوقِ سفر وہی ہے جو تھی
اگرچہ پا بہ سلاسل ہوں اک زمانے سے

زمانہ ہو گیا تاراجیِ چمن کو مگر
دھواں سا آج بھی اٹھتا ہے آشیانے سے

مجھے تھا وہم تجلی ہو کے منفعل ہوں گے
مگر وہ اور حسیں ہو گئے لجانے سے

نہ چھیڑ قصۂ بیدادِ دوست اے ہمدم
دل اور ڈوبنے لگتا ہے اس فسانے سے

کبھی جنوں میں سکوں اور کبھی سکوں میں خلش
یہ دل لگی ہے تو باز آئے دل لگانے سے

اُمیدِ ضبطِ غمِ دوست ہے عبث شمسی
یہ آگ اور بھڑکنے لگی بجھانے سے

متاعِ دل

ذکار الدین شایاں

(مرکزی خیال براؤننگ کی ایک نظم سے ماخوذ)

اک گلِ تازہ کے معصوم تبسم میں نہاں
رنگ و نکہت کے کئی روح فزا افسانے
آرزوؤں کی مہک
فصلِ بہاراں کا شباب

ایک گوہر کے دھڑکتے ہوئے دل میں پنہاں
سنگِ آہن کے کئی ہوش رُبا افسانے
آرزوؤں کی کسک
دولتِ قارون کا جواب

ایک موتی کی جھپکتی ہوئی سیمیں آنکھوں میں
موجِ مضطر کے کئی جلوہ نما افسانے
آرزوؤں کی چمک
بحرِ پُرآشوب کا خواب

رنگ و نکہت، یہ شباب اور یہ دولت یہ چمک لا
لیکن ان سب سے پرے، سب سے حسیں، سب سے بلند
اک حقیقت ـــــ جو گہر سے بھی زیادہ خوش رنگ
اک یقیں ـــــ جو کسی موتی سے بھی تابندہ تر
اک تمنا ـــــ جو کسی پھول سے بڑھ کر نازک
یہ تمنا، یہ حقیقت، یہ یقیں، میرے لئے
[illegible] ترے چہرۂ زیبا کی فقط ایک جھلک

قطعہ

[illegible]

ان کی نگاہِ لطف ہی [illegible]
میرا [illegible] کے ارادے [illegible] گئے
اکثر حیات [illegible]
امید کے چراغ [illegible] گئے

مراسلات

عمر خیام کی رباعیاں

"ہماری زبان" مورخہ یکم اپریل ۱۹۶۱ء کو میں نے ایک مراسلہ بعنوان "عمر خیام کی رباعیاں" پڑھا تھا اور مراسلہ نگار صاحب کو ناموں وغیرہ کی غلطیوں سے آگاہ کر دیا تھا۔

دوسرا مراسلہ اسی عنوان سے "ہماری زبان" مورخہ یکم مئی ۱۹۶۱ء میں بھی نظر سے گذرا۔ بعض اہم مصروفیتوں کی وجہ سے جواب کی طرف پوری توجہ نہ کر سکا۔ مراسلہ نگار صاحب نے اس مراسلہ میں میرے حوالے سے یہ عبارت لکھی ہے: "سال گذشتہ قاری سید کلیم اللہ حسینی نے اسلامک کلچر حیدرآباد میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ چہار مقالہ سے بھی قدیم تر بیہقی کا تتمہ صوان الحکمہ ہے جو ان کے خیال میں ۵۴۹ھ کی تصنیف ہے، حالانکہ خود کتاب کی داخلی شہادت کی رو سے ۵۵۳ھ سے بعد کی تصنیف ہے اور اس طرح چہار مقالہ سے موخر ہے (اگرچہ خیال یہ ہے کہ ۵۶۰ ہجری کے بعد کی تصنیف ہے)"

یہ صحیح ہے کہ تتمہ صوان الحکمہ میں صرف ایک جگہ ابو بکر بن عروہ کا سنہ وفات ۵۵۳ھ لکھا ہے، اس کے سوا اور کوئی ۵۴۹ھ کے بعد کا نہیں ہے۔ میری دانست میں یہ سنہ کئی وجوہ سے صحیح نہیں ہے۔ میں نے ابو بکر بن عروہ کے صحیح سنہ وفات کے لئے تحقیق کی اور بعض محقق پروفیسروں سے بھی اس کے حالات و سنہ وفات کے متعلق تحقیق چاہی لیکن کہیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے متعلق میں نے مندرجہ ذیل تاریخوں اور تذکروں کا غائر مطالعہ کیا ہے۔ وفیات الاعیان ابن خلکان، الکامل فی التاریخ ابن الاثیر، عیون الانباء ابن ابی اصیبعہ، تاریخ الحکماء علی بن یوسف قفطی، ارشاد الاریب الی معرفت الادیب المعروف بہ معجم الادباء یاقوت الحموی، خریدۃ القصر و جریدۃ اہل العصر عماد الدین کاتب الاصفہانی اور دیگر تذکرے و تاریخ میں تلاش کیا۔ مگر لاحاصل۔

تتمہ صوان الحکمہ، جہاں تک علم ہے کسی ہندوستانی کتب خانہ میں موجود نہیں ہے بلکہ لندن اور پارس کے مشہور و معروف کتب خانہ برٹش میوزیم اور اسٹیٹ لائبریری پارس میں بھی اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوتا۔ البتہ برلن اسٹیٹ لائبریری میں اس کا ایک عمدہ نسخہ موجود ہے جس کی نقل میں نے دوران قیام برلن میں کی تھی، اور ہندوستان واپس ہوتے ہوئے استنبول کے کتب خانوں ملا مراد، بشیر آغا، اور محمد پاشا کوپریلی زادہ میں موجود نسخوں سے اس کا مقابلہ کیا تھا۔

تتمہ صوان الحکمہ پر میرا ایک تحقیقی مقالہ جرنل آف دی حیدرآباد اکاڈیمی جولائی ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

یاقوت الحموی نے معجم الادبا، جلد ۵، صفحہ ۲۰۸ پر علی بن زید البیہقی کے خود نوشتہ حالات اس کی تصنیف مشارب التجارب و غوارب الغرائب سے نقل کئے ہیں، بیہقی نے اپنی ۵۵۰ھ تک تصنیف کردہ کتابوں کا اس طرح ذکر کیا ہے:

"وها انا اذكر تصانيفي في هذه المدة و سنة ۵۵۰ھ"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ بیہقی نے اپنی اہم تصانیف کا ذکر کیا ہے جو اس سنہ تک مکمل ہو چکی تھیں۔ ۵۵۳ھ یا اسکے بعد کی تصنیف کا ذکر ۵۵۰ھ میں کیسے آسکتا تھا۔ ہاں اس سنہ تک اس نے تاریخ بیہق اور لباب الانساب اور دیگر کتابیں تصنیف نہیں کی تھیں اس لئے ان کا نام اس فہرست میں درج نہیں ہے۔

یاقوت نے بیہقی کے حالات خریدۃ القصر و جریدۃ اہل العصر سے نقل کئے ہیں۔ اس کتاب کے مصنف عماد الدین اصفہانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے والد کہتے تھے کہ انھوں نے بیہقی جیسا بڑا عالم اپنے حین حیات کسی کو نہیں پایا۔ خریدۃ القصر ایسی کمیاب کتاب ہے کہ اس کا کوئی نسخہ لندن کے برٹش میوزیم اور پارس و برلن کے کتب خانوں میں بھی نایاب ہے۔ میں نے اس مخطوطہ کو اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز لائبریری لندن کے توسط سے ہالینڈ کی اسٹیٹ لائبریری سے مستعار منگوا کر مواد اخذ کیا تھا۔

مراسلہ نگار صاحب نے تتمہ صوان الحکمہ کی تصنیف کا سنہ نہ صرف ۵۵۳ھ تسلیم کیا ہے بلکہ ان کے 'خیال' میں وہ ۵۶۰ھ یا اس کے بعد کی تصنیف ہے۔ معلوم نہیں کہ ان کا یہ 'خیال' کس مواد پر مبنی ہے! ہم نے تو اپنے 'خیالی' سنہ تصنیف کا ثبوت پیش کر دیا ہے، اور تتمہ کے غائر مطالعہ کے بعد اس میں جو سنین قریب اختتام کتاب واقع ہوئے ہیں انھیں ترتیب دیا ہے وہ ۵۴۳ھ سے ۵۴۹ھ تک کے مسلسل ہیں۔ اسکے بعد کا کوئی سنہ موجود نہیں ہے بجز ۵۵۳ھ کے۔ لیکن اس سنہ کے بعد بھی سنہ ۵۴۴ھ، ۵۴۵ھ واقع ہوئے ہیں۔ ۵۴۹ھ تک مسلسل سنین کے واقعات لکھ کر ۳ سال تک خاموش رہ کر ۵۵۳ھ کا سنہ درج کرنا تعجب خیز ہے۔ ہماری رائے میں یہ سنہ غلط درج ہوا ہے جو کسی کاتب کی سہو کتابت کا نتیجہ ہو سکتا ہے، جو عام بات ہے، درمیانی ہندسہ '۵' کے عوض '۴' ہوگا کیونکہ ۵۴۳ھ سے مسلسل سنین شروع ہوتے ہیں ۵۴۳ھ اس کی پہلی کڑی ہو سکتا ہے ورنہ ۵۴۹ھ تک مسلسل سنین کے واقعات بیان کر کے تین سال کے بعد کا واقعہ لکھنا گویا یہ تسلیم کرنا ہے کہ اس مدت میں کوئی قابل ذکر عالم یا واقعہ گذرا ہی نہیں جو بعید از قیاس ہے۔

ہمارے نزدیک تتمہ صوان الحکمۃ کا سنہ تصنیف ۵۴۹ھ مسلم ہے اگر وہ اس سنہ کے بعد کی تصنیف ہوتا تو مصنف اس سنہ میں مکمل شدہ کتابوں کی فہرست میں اس کو ہرگز شامل نہ کرتا جیسا کہ اس نے تاریخ بیہق اور لباب الانساب کو شامل نہیں کیا جو اس سنہ کے بعد کی تصانیف ہیں۔

اگر یہ بھی فرض کیا جائے کہ بیہقی نے مکرر اس کتاب پر نظر ثانی کی ہوگی تو کیا یہ امر تعجب خیز نہ ہوگا کہ اس نے صرف ایک شخص کا ذکر قابل تحریر سمجھا۔ اس کے سوا تین سال میں کوئی اور شخص یا واقعہ قابل ذکر و توجہ پذیر ہوا ہی نہیں!

اگر کوئی علم دوست صاحب ابو بکر بن عروہ کے حالات و سنہ وفات کسی مستند کتاب سے فراہم کر دیں گے تو ہم ان کے ممنون ہوں گے، اور اپنی رائے میں تبدیلی کر سکیں گے۔

تتمہ صوان الحکمۃ اور اس میں عمر خیام کا ترجمہ حال موجود ہونے کا ذکر میں نے اس زمانے میں پیرس میں علامہ میرزا محمد قزوینی سے کیا تھا اور تتمہ کی تقدیم چہار مقالہ پر ظاہر کی تھی، تو انھوں نے فرمایا تھا "آقا آن تحقیق من بود و این تحقیق جدید شما است، آن را تسلیم می کنم" اور مجھ سے خواہش بھی کی کہ میں برلن سے تتمہ میں مندرج ترجمہ حال خیام کی نقل ان کے لئے بھیجوں، چنانچہ میں نے وہ نقل بھیجی۔ علامہ قزوینی نے جب صوان الحکمۃ مصنفہ ابو سلیمان سجستانی پر مضمون لکھا اور تتمہ صوان الحکمۃ کے مصنف بیہقی پر بھی روشنی ڈالی تو خیام کے متعلق میرے مرسلہ نقل کا بھی ذکر کیا جو متعاقب بیست مقالۂ قزوینی حصہ دوم کے عنوان صوان الحکمۃ کے صفحات ۹۹، ۱۳۲ پر مذکور ہے۔

(قاری سید کلیم اللہ حسینی)

غیر ملکی درسگاہوں میں اُردو اساتذہ کا تقرر

ملک میں انجمن ترقی اُردو کی عملی سرگرمیاں سب پر ظاہر ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی کاوشیں قابل مبارکباد ہیں لیکن میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف خاص طور پر مبذول کرنا چاہتا ہوں جو بذات خود ایک غور طلب مسئلہ بھی ہے کہ ہماری یہ انجمن اُردو کے فروغ اور فلاح و بہبود کے لئے بین اقوامی سطح پر کیا کام کر رہی ہے؟ اُردو کی عام مقبولیت کا نتیجہ ہے کہ غیر ملکی درسگاہوں میں اس کو تیزی سے رائج کیا جارہا ہے اور اس کے لئے ہمارے ملک سے بھی اساتذہ فراہم کئے جارہے ہیں۔

راقم الحروف کو کسی سے مطلق ذاتی عصبیت نہیں ہے بلکہ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ غلط انتخابات سے اُردو کی ترقی اور توسیع کی کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ اس کے برعکس اُردو غیر ممالک میں اپنی ہمہ گیر شہرت اور جاذبیت کھو دے گی۔ اس لئے میری رائے ہے کہ انجمن ایک مشاورتی شعبہ یا بورڈ قائم کرے جو غیر ملکی ایجنسیوں کو بوقت ضرورت اپنی خدمات پیش کرے۔ بہتر ہے کہ ملک میں متعین تمام ہائی کمیشن، سفارتخانوں اور قونصل خانوں سے درخواست کی جائے کہ وہ اُردو کے نصاب اور اساتذہ کے انتخاب کے لئے انجمن سے جو کہ ملک کا واحد عظیم اُردو ادارہ ہے مشورہ لیں تاکہ ملک سے قابل اور مستحق لوگوں کا انتخاب ہو سکے جس پر بیرون ملک میں اردو کی ترقی کا انحصار ہے۔ امید ہے کہ میری تحریر کو 'ہماری زبان' کے اولین شمارہ میں جگہ دی جائیگی اور دیگر اصحاب الرائے بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے۔ (احمد فقیہ)

انجمن کا خبرنامہ

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا ایک جلسہ

پٹنہ ۱۰ر جولائی۔ مجلس عاملہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی ایک اہم نشست زیر صدارت جناب محمد ایوب صاحب ایڈوکیٹ سات بجے شام کو انجمن اسلامیہ ہال میں منعقد ہوئی جس میں حسب ذیل حضرات نے شرکت فرمائی۔ جناب سید جعفر امام وزیر جیل، جناب منظور احسن بخاری ایم۔ ایل۔ اے، پروفیسر حافظ شمس الدین، محترمہ تقی امام صاحبہ، جناب محمود عالم مختار صاحب، الحاج جناب مسعود الرحمٰن ایم۔ ایل۔ اے، جناب ڈاکٹر محمد یونس بھاگلپور، حضرت مولانا عثمان غنی صاحب، پرنسپل سید عبد الحمید، محمد ادریس میونسپل کمشنر مظفر پور، نثار احمد خاں ایڈوکیٹ، کامریڈ علی اشرف، شاہ مشتاق احمد، رام سروپ ایڈیٹر سنگم، جناب صدیقی جنرل سکریٹری وغیرہ۔

حسب ایجنڈا طے پایا کہ پٹنہ میں دسمبر یا جنوری میں کل ہند اردو کانفرنس منعقد کی جائے۔ اس سلسلے میں سکریٹری کو مرکز سے ابتدائی اقدامات کے لئے خط و کتابت کا اختیار دیا گیا۔ طے پایا کہ ستمبر کے پہلے ہفتہ میں کسی مناسب تاریخ میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی کونسل (مجلس عام) کی نشست طلب کی جائے۔ پٹنہ میں اردو گلشن ہائی اسکول کھولنے کے ابتدائی اقدامات پر بھی غور کیا گیا اور اس سلسلے میں طے پایا کہ آئندہ نشست میں تفصیلی اسکیم پر غور کیا جائے۔ ایک تجویز کے ذریعے مجلس عاملہ نے جناب سید جعفر امام صاحب سے استدعا کی کہ وزیر اعلیٰ بہار کی توجہ ریاستی انجمن ترقی اردو کے وفد کی ملاقات کی طرف وہ مبذول کرائیں اور مجلس عاملہ کی طرف سے وزیر اعلیٰ ایک مناسب تاریخ جلد ہی وفد سے ملاقات کے لئے مقرر کرانے کی کوشش فرمائیں۔

مظفر پور انجمن ترقی اردو کے انتخابی مسئلے پر بھی مجلس عاملہ نے ایک مناسب تجویز منظور کی جس سے توقع ہے کہ مظفر پور شاخ اپنے کاموں کو آگے بڑھانے کا مناسب موقع حاصل کر سکے گی۔

طے پایا کہ جمشید پور شاخ کا انتخاب ماہ اگست تک ختم کر لیا جائے۔

مجلس عاملہ کے علاوہ مختلف اضلاع کے اردو سے دلچسپی رکھنے والے کارکنوں نے بھی شرکت کی۔

تلگو کے ساتھ اردو کو بھی استعمال کرنے کی اجازت کا مطالبہ

حیدرآباد ۱۰ر جولائی۔ بسری رنگدم ریڈی ایم۔ ایل۔ اے، چندر سریواستو معتمد انجمن تحفظ اردو، ایس۔ آر، ہریش چندر، سید جلیل گوڑہ معتمد ضلع کانگریس کمیٹی نے ایک مشترکہ بیان کے ذریعہ آندھرا پردیش میں تلگو کو ۲-۳ سال کی مدت میں بتدریج نظم و نسق کی زبان بنانے اور تلگو کے ساتھ اردو کے موجودہ سرکاری استعمال کو مستقبل میں تعلقہ اور ضلع کی سطح پر برقرار رکھنے کی اپیل کی ہے۔ مشترکہ بیان میں کہا گیا ہے کہ مختلف اضلاع میں اردو جماعتوں کے قیام سے متعلق مطالبات کی عدم تکمیل کے نتیجہ میں اردو بولنے والوں میں تشویش پائی جاتی ہے۔ جماعتوں کے قیام کے سلسلے میں عوامی عطیہ کا "لزوم" بھی اردو تعلیم کی توسیع میں رکاوٹ بن چکا ہے۔ ان قائدین نے اردو جماعتوں اور مدارس کے قیام سے متعلق مطالبات کو عطیہ کے لزوم سے مستثنیٰ قرار دینے، آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے اردو میں بھی علاقائی خبریں اور اسمبلی و کونسل کی کارروائی پر تبصرہ کرنے اور خانپور ضلع عادل آباد میں اردو سیکشن کے قیام کی منظوری دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ (سیاست حیدرآباد)

امتحانات جامعہ اردو

امتحانات جامعہ اردو۔ ابتدائی، ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کے فیس و فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ ۱۴ر اگست ۱۹۶۱ء ہے۔ فیس تاخیر کے ساتھ فارم و فیس صرف ۵ر ستمبر ۱۹۶۱ء تک داخل کی جا سکتی ہے۔ یہ امتحانات ۲۰ر نومبر ۱۹۶۱ء سے شروع ہوتے ہیں۔ امیدوار حضرات رجسٹرار جامعہ اردو کو ۲۵ نئے پیسے ارسال کر کے نصابات و قواعد امتحانات جامعہ اردو حاصل کر لیں۔

جامعہ اردو کے امتحانات کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جموں و کشمیر یونیورسٹی، راجستھان یونیورسٹی، اجمیر ہائر سکنڈری بورڈ، راجستھان سکنڈری بورڈ، مدھیہ بھارت ہائر سکنڈری بورڈ، دلی ہائر سکنڈری بورڈ نے مختلف نوعیتوں سے ہائی اسکول انٹرمیڈیٹ، پٹنہ یونیورسٹی اور بی۔ اے کے صرف انگریزی امتحانوں کے لئے منظور کر لیا ہے۔ جس کے ذریعے ایم اے۔ ایل ایل بی اور بی یو ایم ایس طبیہ کالج وغیرہ میں داخلہ ممکن ہو گیا ہے۔

ان امتحانات میں شرکت کے علاوہ تعلیمی ملازمتوں میں تقرر کے لئے بھی راجستھان بورڈ، دلی ہائر سکنڈری بورڈ اور یو پی بورڈ الہ آباد نے منظور کر لیا ہے۔ اس سلسلے کی تمام تفصیلی معلومات رجسٹرار جامعہ اردو علی گڑھ سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

(رجسٹرار جامعہ اردو)

بقیہ

لسانی کمیٹی اترپردیش کا پہلا جلسہ

انھوں نے کہا کہ ایسا فرض کرنا غلط ہوگا کہ اُردو رسم خط باہر سے آیا ہے۔ تاہم اگر ایک رسم خط ہو جائے تو اس سے بہت بڑا فائدہ ہوگا۔

انھوں نے کہا کہ تمام دنیا میں بول چال کی عام فہم زبان کو ادبی زبان بنانے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اچاریہ کرپلانی نے پریم چند، ٹیگور اور گاندھی جی کی مثال پیش کی کہ انھوں نے کس طرح بول چال کی عام فہم زبان کو ادبی زبان بنا دیا۔ اردو اور ہندی کے سلسلے میں اگر اس اصول کو اپنایا جائے تو ہماری بہت سی مشکلات اور اس سے متعلق نزاع ختم ہو جائے گی۔ ہندستان کی سرکاری زبان کو پنڈتوں کی اور اردو کو مولویوں اور مولاناؤں کی زبان نہیں بننے دینا چاہیے جس کو بہت کم اشخاص سمجھ سکتے ہیں۔

اردو سے متعلق آج کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ کہا جانا چاہیے کہ "یہ ایک اقلیتی زبان ہے اور وہ کسی مخصوص اقلیتی فرقے کی زبان نہیں ہے" اس کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اترپردیش کے عوام کی صرف ایک اقلیت اُردو زبان کو بول چال اور لکھنے میں استعمال کرتی ہے۔ لیکن اس اقلیت میں اکثریت اور اقلیت کے دونوں فرقوں کے افراد کے ساتھ ساتھ عیسائی اور سکھ بھی شامل ہیں۔ اقلیتوں کی زبان سے یہ مراد ہے کہ اس کے حامی کسی مخصوص مذہبی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اُردو کے حامیوں میں ہندو مسلمان اور عیسائی وغیرہ سبھی فرقے کے لوگ شامل ہیں۔ اردو کو ایک اقلیتی فرقہ کی زبان کہنا اس کی حیثیت کو گھٹانا ہے۔

انھوں نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ اردو زبان استعمال کرنے والوں میں مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی تعداد کم ہو لیکن اس کو اقلیتی فرقہ یعنی مسلمانوں کی زبان کہنا غلط ہوگا۔

اچاریہ کرپلانی نے کہا کہ اقلیتی زبان کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ اس کا مکمل طور پر تحفظ کیا جائے اور اس کے فروغ اور توسیع کے لیے تمام سہولتیں فراہم کی جائیں۔

کسی زبان کا تحفظ اور اس کی ترقی کے لیے سرکاری امداد کے سلسلے میں انھوں نے کہا کہ سرکاری امداد کسی زبان کی ترقی میں بہت کم معاون ہو سکتی ہے اور انعامات کے ذریعے حکومت کی سرپرستی سے بھی زبان کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ زبان کی ترقی بڑی حد تک اس کے بلند پایہ ادیبوں پر منحصر ہوتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حکومت مناسب اور جائز امداد نہ دے۔

کمیٹی کے قریبی حلقوں نے آج کے جلسے میں اردو و ہندی ادیبوں کا مسائل کے سلجھانے میں باہمی تعاون کو کمیٹی کی کامیابی کے لیے فال نیک قرار دیا ہے۔ معتبر ذرائع کے مطابق آج کے جلسے میں جو امور زیر غور آئے وہ سب بغیر کسی اختلاف کے طے ہو گئے ہیں یہ کمیٹی کے دستور کی بھی منظوری بھی شامل ہے معلوم ہوا ہے کہ کمیٹی کے سامنے حکومت یوپی کی طرف سے اردو زبان کے سلسلے میں سرکاری اعلانات پر عمل درآمد کے سلسلے میں ایک تحریر پیش کی گئی جس کے بہت سے پہلوؤں کو وضاحت طلب قرار دیا گیا کمیٹی نے سرکار سے خواہش کی کہ کل کے جلسے میں وضاحت طلب پہلوؤں کی وضاحت کی جائے۔

کمیٹی کی تیسری نشست میں دو سوال نامہ مرتب کیا جائے گا جو اردو ہندی ادیبوں اور ان زبانوں سے دلچسپی لینے والوں کو جواب کے لئے بھیجا جائے گا۔

کمیٹی کے فیصلے کے مطابق کمیٹی کی کارروائی ہندی میں لکھی جائیگی جس کا اُردو ترجمہ بھی ممبران کمیٹی کو دیا جائے گا۔

عبدالمغنی

کیچلیاں اور بالِ جبریل

افسانے کے موضوع اور ہیئت کے بارے میں ذہنی آوارگی ہمارے یہاں ابھی تک چلی جاتی ہے۔ ابھی تک لوگ مخصوص قسم کی سادگی و پرکاری پر زور دیتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ موضوع کے متعلق اردو ادیبوں میں عجیب قسم کی ذہنی بے چارگی پائی جاتی ہے۔ دورِ حاضر کا کوئی رسالہ کوئی مجموعہ اٹھا کر دیکھ لیجیے "اکثریت کو تو چھوڑیے" ہمارے بڑے افسانہ نگاروں کی خاص سے خاص اقلیت بھی اس عمل پر متفق نظر آتی ہے کہ کوئی کہانی مرد اور عورت اور گھر کے مثلث سے بال برابر تجاوز نہ کرے۔ کسی شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے لب، جسم کے دل آویز خطوط، گھر کی الگنائی اور بچوں کی قطاروں سے بڑھ کر کوئی مضمون نکلتا ہی نہیں۔ جو ہے اپنے پیار یا روٹی کا رونا رو رہا ہے۔ کہنا چاہیے کہ اردو افسانہ نگاری کا نقش روز بروز تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا جا رہا ہے، ایک ہی موضوع کی تکرار سے بے کیفی اور اکتاہٹ پیدا ہو رہی ہے۔

اس محبوس فضا میں جناب اختر اورینوی کا تازہ ترین مجموعہ "کیچلیاں اور بالِ جبریل" کشادِ دل و نظر کا سامان بہم کرتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ اردو افسانہ نگاری میں نئے آفاق کی جانب پرواز کی صلاحیت ابھی باقی ہے۔ انسانی دل کی گہرائیاں، دماغ کی بلندیاں اور کائنات کی وسعتیں بھی کہانی کے مختصر کوزے میں بند کی جا سکتی ہیں اور یہ کہ افسانہ محض احساسات کی برانگیختگی کا نام نہیں یہ ادراک کو بھی مہمیز کر سکتا ہے۔

اس وقت اختر اورینوی کے نو یا دس کے مجموعے پر تبصرہ مقصود نہیں۔ صرف عنوان میں دیے گئے افسانے کے متعلق چند خیالات پیش کرنے ہیں۔

یہ ایک سراسر فلسفیانہ کوشش ہے۔ اس میں صرف افکار کا پیکر تراشا گیا ہے۔ کوئی کردار، کوئی واقعہ نہیں۔ ایک ماجرا ضرور ہے۔ لیکن یہ ایک انوکھا ماجرا ہے، جس میں نہ کوئی ہیرو ہے، نہ ہیروئن، نہ گھر نہ در۔ یہ انسان کی تخلیق اور کائنات کی تنظیم کا ماجرا ہے، جو ازل سے شروع ہوتا ہے اور ابد کی طرف بڑھنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ خودی اور خدا کے درمیان رازو نیاز ہے، انفس و آفاق کے پس منظر میں۔ یہ المیہ ہے اور طربیہ بھی ہو سکتا تھا۔ اس میں دانتے کی ڈوائن کامیڈی سے گوئٹے کے فاوسٹ تک کا نچوڑ ہے۔ مگر یہ معلوم نہیں کیوں اقبال کے جاوید نامہ تک نظر رسا نہیں ہوئی، حالانکہ پورے افسانے کا لفظی تار و پود (غالب اور) اقبال کی تلمیحوں اور استعاروں سے ہی تیار کیا گیا ہے۔

میرے خیال میں انسانی خودی کے مارِ سیاہ کی کیچلیوں اور انسان کے اندر پوشیدہ ملکوتی بالِ جبریل کی یہ کہانی صرف اردو میں نہیں عالمی ادب میں پہلی بار اس جامعیت اور بصیرت کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ ارتقائے آدم سے متعلق خدائی اور انسانی شاہدی کوئی قابل ذکر نظریہ جو چھوٹ گیا ہو۔ دنیا کے تمام مذاہب اور فلسفے، یہاں تک کہ شاعری اور افسانے بھی نچوڑ دیے گئے ہیں۔ برہمنیت، بودھ مت، نصرانیت، یہودیت، عیسائیت، اسلام، بودھ ازم ــــ مارکس، فرائڈ، آئن سٹائن ــــ

وانتے، شیکسپیئر، گوئٹے .... سبھی کی تعبیریں پیش کر دی گئی ہیں۔ چنانچہ اس کثرتِ تعبیر سے خواب پریشاں بھی ہو گیا ہے۔ اتنے وافر اور متنوع مواد کو سمیٹ کر جو چیز مربوط اور دلچسپ بناتی ہے وہ افسانہ نگار کا خلوص اور جوشِ طبیعت ہے جو موزوں الفاظ اور فقروں کے تند سیلاب کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ درحقیقت یہ ایک منثور نظم ہے جس کی رنگینیوں اور گہرائیوں میں ہم کھوئے جاتے ہیں۔ اس افسانے کو پڑھ کر مجھے ویسا ہی فنی تاثر ہوا جیسا اقبال کے "ساقی نامہ" کو پڑھنے سے ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عمیق تخیلات کی شدت کے سبب تندیِ صہبا سے آبگینہ پگھلا جاتا ہے۔

اس افسانے کی تکنیک کے متعلق کچھ کہنا غیر ضروری ہے۔ افسانے کی ٹکسالی ہیئت سے اس کا کوئی تعلق نہیں اس لیے کہ اس کا تخیل افسانے کے ٹکسالی موضوع سے یکسر مختلف ہے۔ یہاں ایک مخصوص اسلوبِ تخیل کی جامہ آرائی کے لیے ایک تازہ، انوکھا پیکر تراشا گیا ہے۔ اس کے اندر بجز روانیِ بیان اور فضا کی طلسمیت کے عام کہانی کی کوئی خصوصیت نہیں۔ دراصل یہاں موضوع اور اس کا تخیل ہی سب سے شاعرانہ ہے۔ کائنات کی پہنائیوں میں حیاتِ انسانی کے نمود اور عروج کی داستان، زر، زمین، زن کے عام افسانوی تخیل سے یہاں کوئی بحث نہیں چنانچہ انفس و آفاق کی گہرائیوں کو ناپنے والے اس شاعرانہ تخیل کو ایک مشاعرانہ ہیئت کے ذریعے ہی پیش کیا گیا۔ صحیح فنی تاثر کی کوئی دوسری صورت مخصوص فکر کے پیشِ نظر ممکن ہی نہیں تھی۔ نتیجۃً افسانے کا ایک ایسا نثری قالب سامنے آتا ہے جو جملوں کی ترکیب کے علاوہ باقی ہر اعتبار سے نظم ہے۔ افسانوی ہیئت میں یہ ایک جرأت مندانہ تجربہ ہے جس کی کامیابی کی دلیل صرف یہ ہے کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے ایک طلسمی جزیرے میں پہنچ جاتے ہیں اور فنکار کا مقصود ہم پر پورے طور سے واضح ہو جاتا ہے۔

اس افسانے کے متعلق بحث کی جو کچھ گنجائش ہے فکری سطح پر ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا سوال تو یہی اٹھتا ہے کہ ایک ایسے راز کی جستجو کی آخر ضرورت ہی کیا ہے جس کی حقیقت ہماری نگاہوں سے سیکڑوں سال کی تحقیق و تلاش کے بعد بھی آج تک اوجھل رہی ہے اور جس تک پہنچنے کا کوئی معتبر ذریعہ ہمیں ہنوز میسر نہیں آیا، جس کی جستجو کا حاصل گمانوں کی اندھیری گلی میں بھٹکنے کے سوا کچھ نہیں۔ اس کا جواز ایک ہی ہو سکتا ہے۔ انسان کا فطری تجسس یعنی انسانی جبلت کا وہ تقاضا جس میں ابلیس کی سوالی رہٹ کا خمیر ملا ہوا ہے، جو ہر "کیا" کی تحصیل کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ اسے "کیوں" کا علم بھی حاصل ہو جائے، تبھی وہ کیسے کی طرف پیش قدمی کرے گا۔ شک نہیں کہ تفکر اور تدبر انسان کا مایۂ امتیاز ہے لیکن یہ حال اس کی کچھ عملی حدیں ہونی چاہئیں اور ہیں بھی، مختاری نہیں تو مجبوری کی حالت میں۔ دراصل، فکر ایک بلائے جانکاہ ہے، اگر عمل سے وابستہ نہ ہو، فکرِ محض آدمی کو بالآخر دیوانہ نہیں تو مجذوب کا رِ دنیا کے چھوڑتی ہے۔ اب تک کی فلسفہ آرائیوں سے سبق یہی ملتا ہے کہ ہماری فکرِ رسا کا دائرۂ عمل محفوظ طریقے پر ہمارے وجودی معاملات تک ہی ہے۔ اس کے آگے وہ خطرناک گھاٹیاں اور کھائیاں شروع ہو جاتی ہیں جن کے بارے میں شیخ سعدی کہہ گئے ہیں ــــ

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار • کہ پیدا نہ شد تختہ بر کنار

چنانچہ "کُن" "فیکون" "قاب قوسین" "صبحِ ازل اور شامِ ابد" جیسے رمزیاتی استعاروں کے متعلق ہمارے لطیف احساسات جو بھی ہوں انھیں واضح اور الفاظ کی شکل میں متعین کرنے کی کوشش پانی پر آڑی ترچھی لکیریں بنانے سے زیادہ نتیجہ خیز نہیں۔ فن اس کا نام نہیں کہ کوئی صاحب لوح و قلم اپنے مبہم احساسات کے پیچ و خم کی تصویر کشی کرے۔ فن ایک واضح اور قطعی عمل ہے۔ فن بڑے ضبط کا طالب ہے۔ اس کا مصرف یہی ہے کہ امتیاز و انتخاب سے کام لے کر زندگی کے اُلجھے ہوئے مظاہر کو اپنی حکمت اور بیان کے ذریعے ایک ایسی واضح شکل دینے کی کوشش کرے جس کو دیکھ کر ہم اپنی ذہنی شخصیتوں میں کسی کا احساس کریں۔ چنانچہ ایسے موضوعات سے تعرض کی نتیجہ خیزی مشکوک ہے جس کے متعلق ہماری واقفیت کا حال یہ ہو کہ

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی • نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

"کپکلیاں اور بالِ جبریل" گمانوں پر مبنی ایک ادھوری 'ناآگاہ حکایتِ ہستی' ہے۔ اور جناب اختر اورینوی اپنی اس انسانی تنگ دامانی سے واقف ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے اپنے مبہم احساسات کی تشکیل کے لئے متعدد شعرا کے استعاروں کا سہارا لیا ہے۔ کیونکہ مشاہدۂ حق کی گفتگو 'بادہ و ساغر' کہے بغیر بن آ ہی نہیں سکتی۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے غالب کے مشہور شعر:-

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

کو مختلف ابواب میں تقسیم کر کے اپنے تخیل کا ڈھانچہ تیار کیا ہے۔ افسانے میں اس شعر کی کلیدی اہمیت قصے کے دوران ظاہر کئے گئے فکری میلانات سے مل کر یہ کچھ تاثر دیتی ہے :-

۱۔ آدم کی تخلیق عروج کا نہیں 'زوال' کا باعث ہے۔
۲۔ تخلیقِ آدم کا محرک و مقصود خالق کی خود بینی ہے۔

یہ خلاصہ ہے پورے افسانے کی اس فضا کا جس میں قنوطیت جبریت، ثنویت، وحدت الوجودیت وغیرہ کے عناصر نمایاں ہیں۔

——— 'ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں'۔

'ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی'، 'خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ'، 'ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا + نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا' کی نسبت۔ خالق کی طرف جیسی لکیروں سے ہی پوری کہانی کا دائرہ بنتا ہے۔ حکایتِ ہستی سے یہ تاثر، ارتقائے آدم کے لئے کہاں تک حوصلہ افزا یا حوصلہ فرسا ہے اور اس تاثر سے فن کی ذمہ داری کہاں تک سرانجام ہوتی ہے۔ اس کا فیصلہ خود فنکار کے بجائے حق ضمیر پر چھوڑنا چاہیے۔

ان قدرتی حدود کے اندر زیرِ نظر افسانہ ایک عظیم فنی کوشش ہے۔ اگرچہ میں ترویس کی مثال کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ عالمی ادب میں یہ ایک طُرفہ افسانہ ہے۔ اس میں چند اہم انسانی افکار پر بعض تبصرے بڑے دقیقہ رس اور بصیرت افروز ہیں۔ میں اس مضمون کا خاتمہ چند ایسے ہی گرہ کشا ٹکڑوں پر کرنا چاہوں گا۔

'... زمانے ارتقائے مجھے حشرات و وحوش سے آدمی بنایا ہے۔ یا ناسخ مجھے آدمی سے وحوش و حشرات میں بدلتا جاتا ہے۔'

'......تب یہ روح تنہا ہوا کہ میں نے دنیا کو تیاگ دیا۔ آتما کے نروان کی تلاش میں۔ مجھے گیان کی روشنی ملی۔ اس نے مجھے بکھر جانے ڈالا۔ میں نے اپنے جذبات، خیالات اور ادراک کے شعلوں کو ٹھنڈا کیا۔ روح نے جونوں کے چکر سے، کرموں کے گت سے، بدن کے دبدبے سے مکتی حاصل کرنے کا راز دریافت کر لیا۔ لیکن پھر آتما اپنی پوترتا کے فکر میں اتنی کھوئی کہ پرماتما کو بھول گئی۔ جونوں کا چکر پھر شروع ہو گیا۔ اور بدلا دھندلا پاگل چھایا!'

'...... وہ شعر سے ریا اور غاروں سے طلوع ہوا اور دس ہزار قدسی اس کے ہمرکاب تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت تھی۔ ایک چمکتا ہوا قانون، ایک مثالی نظام۔ روحِ آدم نے اپنا بلند ترین مقام حاصل کر لیا۔ خدا اور خودی اتنے قریب ہو گئے جیسے قاب قوسین ......'

'......مارکس نے فرعون کا مقابلہ کیا اور موسیٰ سے بھی منحرف ہو گیا۔ یہودیوں کی فطرت میں بغاوت ہے۔ اپنے پرائے سب سے۔ خدا اور شیطان دونوں سے ....'

'............ خدا مادہ معصوم نہیں! میں یوم میزان میں خدا کی ترازو پکڑ کر فریاد کروں گا۔ میری روح کی گنہگاری کا بڑا حصہ مادہ ہے۔ مادہ کی صفت مادیت ہے اور آریائی قالب کے اندر چھپا ہوا تھا۔ آریائی قالب میں مادیت، مادہ پرستی یعنی خود پرستی تھی۔ مظاہر پرستی، شرک اور دہریت تھی۔ آریائی یا یوروپ والوں نے میری اشتمالیت، مساوات و جمہوریت کو بھی آمریت اور پاکی سرمایہ داری میں بدل دیا ....' (مارکس کے انسانی قالب کی فریاد روس اور چین کی کچھ فکریوں کے خلاف)

' میں خارجیت، عقلیت اور مادیت سے گھبرا کر سیدھا لاشعور کی دنیا میں پناہ کے لئے جا پہنچا۔ یہ بھی اسرائیلیت کا انتہا پسندانہ دورہ تھا۔ عبرانی قالب زیادہ انتہا پسند ہوتے ہیں اور یونانی متوازن ——— لیکن یہ اپنے توازن کو ہی پوجنے لگتے ہیں۔ عبرانی مزاج بُت شکن ہوتا ہے اور گاہ خدا شکن بھی۔ یونانی مزاج اپنی وسعت و رواداری میں ہیلٹ سے خدا بنا لیتا ہے۔ سلامتی نہ یہاں ہے نہ وہاں۔ اور لاشعور کی دنیا تو نہایت تاریک، وحشی، دہشت ناک تھی۔ لاشعور کی سیادت تسلیم کر لینی اپنی ہفت ہزار سالہ زندگی کے ارتقا کا انکار تھا۔ ادراک کی نفی تھی، لطافتوں اور رفعتوں کا انکار تھا۔ یہ لاشعور بھی داخلی مادہ پرستی تھی ؛'

'——— یہ تو بڑا غنیمت ہوا کہ ایک تیسرے اسرائیلی قالب کی بت شکنی نے میری مدد کی۔ میں نے آئن سٹائن کے دماغ میں گھس کر پناہ لی۔ میں نے مکان و زمان کو ازل و ابد کے سانچے میں گڑ دکھایا۔ میں نے کائنات کی بیکرانی کو محدود کیا اور لا محدود کو محدود پایا اور ان گنت کائناتوں کا پتہ ڈھونڈ نکالا۔'

ضروری اعلان

براہ مہربانی خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے

منیجر

کوئی شے مطلق نہ تھی۔ ہر شے اضافی تھی۔ یہ دریافت مارکس کی "لا" سے زیادہ اہم "لا" تھی مگر سوے "الا" سفر کرنے والی۔ جدید طبیعیات کے مشاہدہ و تجربہ نے مجھ پر وحدت روحانیت کے دروازے کھلنے لگے۔ بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے میں نے یہ راز پالیا کہ مادہ غیر فانی نہیں۔ یہ فنا ہو سکتا ہے۔ ہر چند کہ ہنوز مادہ میری روح پر غالب ہے تاہم میں نے اپنی فتح کا راز ڈھونڈ لیا ہے۔ لیکن میں مادہ کو ہلاک کرنا نہیں چاہتا اس کی سیادت مٹانا چاہتا ہوں۔ اور مادہ مجھے فنا کرنے کے درپے ہے۔ خواہ غارت گری کے ذریعہ ہی سے کیوں نہ ہو۔

اس طویل ایمائی افسانے کا اختتام مستقبل کی جس پیش گوئی ——— یک چشم ویوزاد دجّال صلیب اٹھائے، اور آزاد پرومیتھیوس بپھرے ہوئے خنزیر پر سوار نفس انسانی کے ان مہیب مظاہر کی ہولناک آویزش۔ اس کے بعد روح آدم کی آخری نجات کے متعلق امید و بیم کے درمیان بٹی ہوئی جس حسرت ناک آرزو پر ہوتا ہے وہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے ایک نازک لمحۂ فکر مہیا کرتی ہے ——— کاش ایشیائی محاورات و استعارات سے لبریز اس اہم تخلیق کو یورپی زبانوں میں منتقل کیا جا سکتا!

